ہمچو اد ھم بحر حق با یک پیالہ جستہ اَم　　مثل قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

دُرِ عینی

حیات قبلہ بابا عبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۷

دو (۲) بتی ایک لو

ذاتِ حق جلال، جمال کا توحیدی، تجریدی انداز۔ عشق اور حُسن کی یکتائیت وحدت مرد مظہر عقل کُل، عورت مظہر نفس کُل۔ دونوں یکتائیت ایک توازن میں قائم ہوں تو توحید کو قیام، وجودِ انسانی میں عطا ہو۔ یہ دونوں حقیقتیں زوجین ہیں، ضدین ہیں۔ ان متضاد صلاحیتوں کے وجود سے عالم امکان میں بھی یکتائیت کا رنگ ہے۔ مرد آسمان ہے تو عورت زمین۔ زمین اپنی طرف کھینچتی ہے، کشش رکھتی ہے تو آسمان میں بھی وسعتیں ہیں، پھیلاؤ ہے۔ عورت کی فطری جاذبیت، اصلہا ثابت بن کر مرد کو اڑنے سے روکے رکھتی ہے۔ بندگی کے رشتہ سے باندھے رکھتی ہے۔ حوا کی تخلیق آدمؑ کی پسلی سے ہوتی ہے۔ ربوبیت کا پہلو بن کر نسل کی بھی ضامن بنیں اور قیامِ حقیقت کی بھی۔ جب طالب حق کا سینہ عشق سے سمندر ہو جائے تو اس کو ایک کنارہ ایک زمین عطا ہوتی ہے عشق کی جمعیت کی جو اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ دوئی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک نورِ حقیقت بنا ہے تو دوسرا ربوبیت کا مقام حاصل کئے ہے اور دونوں صلاحیتوں کے امتزاج سے شجر مبارک کا انداز قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح انفرادی نشوونما اور عظمت کی پرورش میں عورت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں دو بتی ایک لو بن کر دونوں حقیقتیں ایک ہی توحید میں منسلک ہوتی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب قبلہ کی عمر ۲۹ سال کی تھی تو پہلی شادی علی گڑھ میں ایک ایسے خاندان میں ہوئی جن سے تعلیمی زندگی میں برسوں سے واقفیت تھی۔ یہ محترمہ حسین الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کی دختر قمر النساء تھیں جن کی اس وقت تقریباً اٹھارہ سال کی عمر ہوگی۔ یہ تعلیم منزل میں رہائش پذیر تھیں جو ان کے والد محترم کی جائداد تھی۔ اس جگہ کا نام تعلیم منزل غالباً اس مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ یہاں مختلف طلباء اور طالبات معہ اپنے خاندانوں کے رہائش اختیار کرتے اور یونیورسٹی یا گرلز کالج میں تعلیم پاتے۔ ان خاندانوں میں سے کچھ تو وہیں مستقل قیام پذیر ہو گئے اور کچھ فارغ التحصیل ہو کر چلے جاتے تو ان کی جگہ دوسرے لوگ سکونت اختیار کرتے۔ تعلیم منزل کے ایک گوشہ میں مسجد بھی تھی اور یہ سب علاقہ ایک خصوصی ماحول بن گیا جس میں ایک بااخلاق معاشرہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اور یہی کچھ قبلہ کو اس خاندان سے قریب تر لانے کا باعث بنا۔ اس اخلاق، رواداری، خدمت خلق کے ماحول میں روحانی فروغ کارفرما تھا جو پاک روحوں کو ایک دوسرے کے لئے جاذبِ نظر بنا دیتا ہے۔ قمر النساء بیگم کم عمری میں ہی۔ وارداتِ قلب وروح، تلاشِ حقیقت کی باتوں میں فطری دلچسپی لیتیں۔ ان کو بھی یہ تفکر ہوتا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، حق کیا ہے۔ حقیقت سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ حسن باطن نکھرا تو اس کا ظل جسد خاکی پر پڑا۔ اپنی منزل کی راہ اسی راہرو کے ساتھ چلنے کی ٹھانی۔ مگر اس دنیاوی ماحول میں یوں رفیق راہ پالینا آسان نہیں ہوا کرتا۔ معاشرہ اخلاق، خاندان، تہذیب، اقتصادیات اور ایسی ہزاروں رکاوٹوں کو عبور کرنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ ابھی قبلہ کی بھی تعلیمی زندگی کا زمانہ تھا اِدھر طلب روحانی نے عشق کی صورت اختیار کی۔ فصل بڑھنا شروع ہوا۔ کیسی ملاقات، کیسا ملنا جلنا۔ دیدار بھی ایک حجاب عشق کے ظہور کے ساتھ ساتھ پاک روحوں کو تو اور پردوں میں ہو جانا ہوتا ہے۔ اب وہی تنہائیاں، وہی شب بیداری، وہی صحرانوردی۔ کئی برس اس ہیجانی کیفیت میں گزرے جسم وجان کی حد سے پرے روح میں حیاتِ عشق لئے ہو تو جسم کیسے مرے۔ اسی اندرونی آگ کو لے کر جب بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں پہلی بار ناگپور پہنچے تو بابا صاحب اس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ پہلے ہی دیدار میں پیکر حُسن کا وہ جلوہ بابا صاحب نے دکھایا کہ اب قبلہ نے

حُسن حقیقت کو جسم کے سراپا کے محدود دائرے سے پرے لازمان ولامکان کی وسعتوں میں پالیا۔ تاج الدینؒ کا رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ مدارس سے علی گڑھ آتے جاتے ناگپور اتر کر باباصاحب کو حاضری دینا لازمی سا امر بن گیا۔ پھر وہ بھی دن آیا جب باباصاحب نے کمر پر لگے مارے اور دو ڈھائی سال قبل پر جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ عشق نے اس جذب کے عالم میں اپنی مکانی زنجیروں کو توڑ کر لامکان میں منزل پائی۔ پھر جب باباصاحب کی شفقت سے یہ جذب کا پردہ اٹھا ہوش و حواس کی دنیا میں واپسی ہوئی تو پھر سے تعلیمی سلسلہ جاری ہوا اور ولایت جا کر شیفیلڈ سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر جب علی گڑھ آئے اور یونیورسٹی میں کام شروع کیا تو قمر النساء بیگم سے شادی ہو گئی۔ مگر یہ ساتھ صرف ڈیڑھ دو سال رہا۔ ایک فرزند تولد ہوئے جن کا نام اجمیری نسبت سے معین احمد رکھا گیا۔ اس زچگی کے بعد ہی سے قمر النساء بیگم پلنگ سے نہ اٹھ سکیں۔ ان کی اسی بیماری کے زمانہ کی بات ہے کہ باہر کے کمرہ میں قبلہ ایک رند منش سے باتیں کر رہے تھے اس نے قبلہ کو ایک واقعہ سنایا کہ اسے ایک مجذوبہ ملی جس نے پوچھا۔ ''ہے'' وہ سمجھا کہ خدا کا پوچھتی ہے۔ کہا۔ ہو گا، مجذوبہ نے پھر پوچھا ''ہے'' تو اس نے جواب دیا ہونا تو چاہئے وگرنہ یہ سارا دھندا کیسا۔ اُس مجذوبہ نے پھر پوچھا ''ہے'' تو اب اُس رند منش اور مجذوبہ پر ''ہے'' کی واردات طاری ہوئی اور وہ پکار اٹھا ہے اور مجذوبہ اور یہ رند منش دونوں ہے۔ ہاہاہا کرنے لگے اور لطف یہ کہ قبلہ کو جب یہ واقعہ سنایا جا رہا تھا تو قبلہ اور یہ رند دونوں ہے ہے ہاہاہا کی کیفیت میں آ گئے اور بیمار قمر النساء بھی ساتھ میں اس ''ہے'' کی واردات سے گزر گئیں۔ انہوں نے قبلہ کو بتایا کہ آپ اتنے عرصہ سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر آج مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ قمر النساء بیگم ہوش سے پرے، بیماری کی بنا پر اس نحیف و نڈھال جسم کے بندھنوں سے آزاد ہو جانے کی بنا پر، لطافتوں سے ہمکنار ہوئیں اور ''ہے'' کی واردات سے گزریں۔ جسم و عقل کے بندھنوں سے اس لمحی آزادی ہی میں انسان روح کی وارداتِ وحدت الوجود سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اب قمر النساء بیگم کی روحانی زندگی نے وسعتیں پائیں تو جسم و جان کے بندھن ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے۔ بیماری نے طول پکڑا، مسز نیوس کے ہسپتال میں منتقل کی گئیں مگر علاج معالجہ سے افاقہ نہ ہوا۔ حیات نے ساتھ نہ دیا۔ صرف ڈیڑھ دو سال کے ازدواجی رشتہ میں بندھ کر عین جوانی کی عمر میں ۱۹۳۸ء میں راہیٔ ملک بقا ہوئیں اور اپنے پیچھے ایک تڑپتی روح چھوڑ گئیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع سوزاں جس کی روشنی کا تو نظارہ خلقت کرتی رہی مگر اس سوز تک نہ پہنچ سکی جو اس شمع کے سینہ میں جاں گزیں تھا۔ قمر النساء بیگم کے انتقال سے جو صدمہ قبلہ کو پہنچا۔ وہ ظاہر بیں آنکھیں بھی برابر دیکھتی رہیں۔ اس واقعہ کے بعد نہ قبلہ میں وہ شگفتگی رہی نہ وہ زندگی کا اٹھان۔ جیسے حیات کے چشمے ہمیشہ کے لئے خشک ہو گئے ہوں۔ عام انسانی نگاہوں میں ایک مجنونانہ سی کیفیت ہو گئی انتقال کے بعد تین دن تک کمرہ میں بند رہے۔ نہ کھانا نہ پینا۔ سگرٹوں پر سگرٹیں۔ حالانکہ اس سے پہلے سگریٹ بالکل نہ پیتے تھے۔ اب اس فراق کے بعد وہی ازلی تنہائیاں، ایک غم پنہاں، اسے کون دیکھتا، اندر کا حال کون پائے، یہ غم آہستہ آہستہ قلب و روح میں رِستا رہا۔ جسم کو فنا تھی مگر یہاں خِفا میں، بقا کے سوتے تھے۔ جسم و جان کے سب رشتے ٹوٹ ٹوٹ کر لازمان لامکان میں اپنی روح کو گھمائے پھرتے تھے۔ پھر جس پر حق کی نظر پڑ چکی ہو جو اپنے ہی لئے منتخب کر لیا گیا ہو اس کے اور حق کے درمیان کے سب رابطے ٹوٹ ٹوٹ کر ایک ہی حقیقت میں منسلک ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب یہ غم عشق، ایک غم جہان بن کر پھیلتا ہے۔ اس غم کے ردّ عمل میں زندگی کو ایک نئی کشادگی ملتی ہے۔ ہر مریض، ہر دُکھی انسانیت، ہر معصوم چہرے، ہر شگفتہ روح کے آگے یہ اپنے محبوب کو عشق کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ ایک نیا ہیجان زندگی میں اٹھا ہوتا ہے جیسے بجھتی ہوئی شمع کا دھواں۔ آفاق میں پرواز، ایک بگولا، ایک ہیولیٰ۔ اب ایک نہ بجھنے والی شدتِ عمل کاروبارِ جہان میں بھی رونما ہوتی ہے اور طلب حق میں بھی۔ الغرض قبلہ کی تمام آئندہ زندگی اسی حقیقت کی تابندگی ہے۔ انہوں نے ہر لطافت حسن میں اپنے شوق کا درماں تلاش کیا۔ ہر تپش شوق میں اپنے عشق کا مداوا پایا۔ اس تازہ، معصوم، حسین روپ

کے تصور کو کچھ اس طرح حقیقت بنایا کہ ہر گُل، ہر خوشبو میں اسی ایک حقیقت کی جلوہ آرائی دیکھی جب جانکنی کا عالم تھا، کہتی تھیں کسی نے اپنی زلفوں میں ڈھانپ لیا ہے کیسی مبارک تھی یہ رخصت، کیسی ابدی ہے یہ مُشک یٰسین (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہم بھیس میں بُلبل کے ہر شاخ پہ چہکیں گے

تم بُوئے وفا بن کر ہر گُل میں رہا کرنا

اس طرح یہ باب، قمر النساء بیگم کی رحلت کے بعد بند ہو جانے کی بجائے اور کشادہ ہوا ہے۔ شدتیں اور امنڈ پڑی ہیں، پہلے ایک منزل تھی اب ایک منزل ہزار منزل۔ پہلے ایک دل تھا اب ایک دل ہزار دل، ہر دُکھے دل میں اسے پایا اور اس کے ردِّ عمل میں ہر دُکھے دل والے نے قبلہ کی ذات میں اپنی منزلِ طلب کو پایا۔

الغرض آنے والے چند برسوں تک قبلہ کی جسمانی، قلبی، روحانی زندگی اسی طرح وسعتوں میں پھیل رہی تھی اور اِدھر صیادِ ازل نے اس تڑپتے ہوئے نخچیر کو اپنے جال میں پھر سے پھنسالیا۔ ان حالتوں میں سے کوئی گزر کر دیکھے تو اسے معلوم ہو گا کہ ازدواجی زندگی کیسی کٹھن، کیسی روح فرسا، کیسی زنجیر ہوتی ہے جس کو نبھانا، لوہے کے چنے چبانے، تنور کی آگ میں جلنے سے کم نہیں پھر بھی کارِ مرداں یہی ہے کہ ہر آتش زار کو گلزار بنا دیں۔ ہر خشک کھیتی کو رحمت کے بادلوں سے شاداب کرتے ہوئے گزر جائیں۔ قبلہ کی بڑی ہمشیرہ مطہر النساء بیگم اب بجائے ماں کے تھیں۔ قبلہ کی حالت سے دلگیر ہو کر اور خاندانی ذمہ داریوں کے پیش نظر انہوں نے اپنے جیٹھ شیخ امام صاحب کی لڑکی امام زہرہ خاتون سے قبلہ کی دوسری شادی کرا دی۔ ادھر ننھے معین احمد کی پرورش کا بھی سوال تھا جن کی دیکھ بھال قمر النساء بیگم کی والدہ کے ذمہ ہوئی۔ یہ محترمہ حسن اخلاق کا پیکر تھیں اور جگت باجی کہلاتی تھیں۔ محبت و شفقت کے لحاظ سے ہیرا تھیں۔ یہ ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا اور قمر النساء بیگم کے انتقال کو صرف تین سال ہوئے تھے۔ ادھر اپنا یہ حال کہ زندگی کا سروسامان جیسے لُٹ گیا ہو۔ دوسری طرف بُوجان ماں کی جگہ۔ خاندان کی عزت کا بوجھ اٹھانا ایک فرض انسانیت ادا کرنا۔ مگر غایت نظر سے دیکھا جائے تو ایک طائر لاہوتی کو جس کی پرواز فضائوں میں ہو اس طرح پابند سلاسل کر دیا جائے تو یہ بات خود ایک سانحہ سے کم نہیں۔ قبلہ نے پھر بھی بیگم امام زہرہ خاتون کے ساتھ اچھی طرح زندگی نبھائی۔ خاندانی روایات اور عظمتوں کو آنچ نہ آنے دی۔ حق بشریت کے تحت جو ممکن العمل خدمت تھی وہ ادا کی۔ محبت کا انداز بھی نبھایا۔ اولادیں بھی ہوئیں۔ علی گڑھ کی ملازمت کے دوران، معہ بیوی بچوں کے بنگالی کوٹھی میں مقیم رہے اور کالج کے کاموں میں بھی کوئی دلچسپی میں کمی نہ آنے دی۔ درونِ خانہ اور باہر کبھی کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ جو بات پہلے تھی اس میں کسی طرح کی کمی ہے۔ وہی انجمنیں، وہی محفلیں، وہی خاکساری تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ کالج کے بنانے میں ہمہ تن مشغول رہنا۔ نہ صرف کالج کے لئے سامان مہیا کرنے کی فکر کرتے رہنا بلکہ کالج سے ایک خصوصی جذبہ دلا کر انجینئروں کا فارغ التحصیل کرا کر خدمت خلق کے لئے پھیلا دینا۔

۱۹۴۵ء میں جو کمر کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔ اس پر اور مزید دوبار دہلی میں تانگہ کی سواری میں چوٹ لگی جس سے کمر کی ہڈی کے تین مہرے گل گئے۔ صاحب فراش ہوئے اور وطن بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں بابا قادر اولیاء کے پاس وزیانگرم اسی بیماری کی حالت میں اسٹریچر پر لے جائے گئے اور صحت یاب ہو کر پھر سے علی گڑھ آ کر کچھ عرصہ ملازمت کی۔ پھر جب ۱۹۵۴ء میں بابا قادر اولیاء کے حکم کے تحت پاکستان آنا ہوا تو بیگم امام زہرہ خاتون معہ بچوں کے ہندوستان ہی رہ گئیں۔ اُدھر رشتہ داری کا سوال اور مستقل نقل وطن کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی مجبوریوں کو سمیٹ کر صبر و شکر سے اُدھر

رہیں اور بالآخر وہیں انتقال کیا اور ادھر قبلہ کو مرشد کے حکم پر توکل بر اللہ پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔ فقراء کو حکم کے تحت یہ قدم لازماً اٹھانا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا اولین مقصد خدمت خلق اور تعمیر ملت ہوتا ہے۔ اب پھر سے سمندر کا کنارے سے ساتھ چھوٹا۔ زمین کی آغوش سے محروم ہوا۔ مرد ذات کے لئے عورت ذات ہی کنارہ کی آغوش بنتی ہے۔ مگر جب پانی کو زمین کی آغوش نصیب نہیں ہوتی تو ہوا کی آغوش میں ابر رحمت بن کر پھر سے بلند پہاڑوں کی جانب رخ کرتا ہے۔ بیگم امام زہرہ خاتون کی بھی بلند اخلاقی اور حسن فہم قابل تعریف ہے کہ انہوں نے قبلہ کے اس عزم میں روڑے نہیں اٹکائے اور نہ ہی کسی قسم کا شکوہ شکایت اس وقت یا بعد میں کیا۔ انہیں یہ یقین تھا کہ مرشد کے حکم کے تحت قبلہ کو جو کام سپرد ہوا ہے وہ انہیں بہر حال انجام دینا ہے۔ ان کا یہ صبر ہی راہ حق میں ان کے سہارے کا ضامن بن جائے گا۔

پاکستان آنے کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں پشاور یونیورسٹی میں ملازمت پکڑی تو ایک ہفتہ قبل بی بی قمر النساء مرحومہ کی چھوٹی ہمشیرہ اختر النساء صاحبہ سے شادی کر لی۔ معین احمد کی آگے کی تعلیم کی خاطر بھی گھر بار بنانے کی ضرورت تھی۔ اختر النساء صاحبہ بھی ایک میجر سے پہلی شادی کے بعد بیوگی کے دن گزار رہی تھیں نہ صرف ایک دوسرے کا خاندان بلکہ بائی اختر النساء صاحبہ اور قبلہ ایک دوسرے کو قریبی طور سے برسوں سے جانتے تھے ۔ معین احمد کی پرورش بھی بائی صاحبہ نے اپنی والدہ باجی صاحبہ کے ساتھ مل کر اس شفقت سے کی تھی کہ کم ہی لڑکیاں ایسا کر سکتی ہیں۔ اپنی ناکتخدائی کے زمانہ میں جب ننھے معین احمد کو چیچک کا عارضہ ہو گیا تو گھنٹوں اپنے سینہ سے لگا کر تسلی دیتی رہتیں اور اپنی فکر اس خطرناک مرض میں بھی نہ کرتیں۔ ایک یہی کیا کم احسان تھا جس کے شکرانہ میں یہ تیسری شادی ان موجودہ حالات کے تحت ہونا ضروری تھی۔ پھر اس شادی سے سمندر کو ایک کنارہ نصیب ہوا۔ اس شادی کے بعد دو معصوم، پاک اور قسمت والی روحوں کا عالم وجود میں آنا بھی تو مقرر تھا۔ چنانچہ اس شادی کے بعد دو بچے حبیب احمد اور محمودہ سلطانہ تولد ہوئے۔ مگر ظاہر سے قطع نظر باطن پر نگاہ ڈالی جائے تو رحمتوں کو وجودی شکل میں نازل ہونے کی جو ازلی بیتابی ہے اسے آغوش ملتی ہے۔ راہرو منزلِ حق کو ساتھی ملتا ہے۔ پھر مثبت قطب منفی قطب کی توحید میں توحید کلی نصیب ہوتی ہے جو اس راہ کے لئے ضروری ہے۔

اب قبلہ کا یہ زمانہ فقیری کی بساط پر مسند نشین ہونے کا بھی تھا۔ جس مقصد حیات کی تکمیل کے لئے فقیر کا ظہور ہوتا ہے اس کا حصول اس جسم و جاں، عقل و ہوش، عزیز و اقارب تلاشِ روزگار، خدمت خلق کے بندھنوں میں رہتے ہوئے بھی کرنا ہوتا ہے۔ دست بہ کار دل بہ یار ایک شعار زندگی ہوتا ہے۔ نصب العین وہی فروغ امت۔ طریقہ کار وہی درد امت۔ اس مشن میں، اس حق کی راہ میں خویش اقارب، دوست احباب، اپنے پرائے، کتنی اعانت کرتے ہیں یہ قسمتوں کی بات ہے فقیر مسند ولایت پر ایک کھلی کتاب بن کر پیش ہوتا ہے اور رحمت اللعالمینی وسیلہ سے ایک رحمت عام بن کر خلق میں پیش ہوتا ہے اس حالت میں نہ وہ اپنوں کا ہوتا ہے نہ دوست احباب کا، نہ اعزا اور اقربا کا۔ ہوتا ہے تو بس امت کا، اس کی زندگی امت کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یہی اس کی بنیاد دین، یہی اس کی بساط ولایت۔ بار بار موتوں، درجہ بدرجہ فنا کے بعد اس کو بقائے محمدی نصیب ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ ان شدتوں میں اپنے ساتھ سب کو ان ہی رحمتوں کے بگولوں میں اوپر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ بائی صاحبہ کی فطری ذہانت اور صلاحیت کو دیکھ کر قبلہ نے انہیں بھی اپنے ہی ساتھ فقر کی منزلوں پر اٹھانے کا حق ادا کیا۔ قمر نے اب اختر ہی میں تو جلوہ گری کی تھی۔ بائی صاحبہ نے بھی شادی کی منظوری اور میدان فقر میں ساتھ دینے سے قبل یہ دریافت ضرور کیا تھا کہ آپ نے فقیری لے کر کیا پایا تو جواب میں قبلہ نے مٹی کا ایک ڈھیلا ہاتھ میں اٹھا کر دکھایا جو سونے کا ٹکڑا بن گیا تھا پھر اسے پھینکتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ایسی فقیری کو ایک طرف پھینکتے ہیں اور تمہیں بھی فقر کی منازل میں ساتھ ہی ساتھ چلانے کی کوشش کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قبلہ کے چند خطوط سے اقتباسات درج ذیل ہیں:

یہ خطوط قبلہ نے بائی صاحبہ کو اس زمانے میں لکھے تھے جب وہ جہاں گشتی کے لئے بیرونِ ممالک ۶ ماہ کے سفر پر نکلے تھے اور اس سے قبل جب وہ بابا جان کے دربار قادر نگر جنوبی ہند میں تھے۔

"عشق میں خود داری، خودی، وہ انا، جو حق کی متحمل ہوتی ہے اس قدر جاگ جاتی ہے اور محیط ہو جاتی ہے کہ کوئی دوسرا نظر میں جچتا ہی نہیں عاشق و محبوب کی پیوستہ شدہ روح ایک ہوتی ہے اور توحید کی علمبر دار۔ فٹن کا ایک گھوڑا تیز ہو جائے تو دوسرا بھی خود بخود تیز ہو جاتا ہے ورنہ فٹن راستہ طے کرنے کی بجائے گول چکر کاٹنے لگتی ہے۔

ہر چیز کا وقت معین ہے۔ دعا سے البتہ وقت بھی بدل سکتا ہے کیونکہ جس نے وقت کو خود بنایا ہے وہ اسے بدل بھی سکتا ہے تو بس دعا ہے کہ اے میرے محسن مطلق تیرے کرم و احسان کے میں صدقے۔ بندہ اگر بے چین ہے تو تُو ہی اسے چین دے یا وقت کو بدل کر یا دل کو سکون دے کر اور دل کا سکون ایسا کہ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔

محبت مرکز مانگتی ہے بابا جان نے ایک سمندر پلا دیا۔ اس سمندر کی ساحل تم ہو۔ مجاز اور حقیقت کا سوال نہیں۔ دونوں ایک ہیں۔ یہ ازلی اور ابدی جذبہ ہے باقی معمول کے واقعات سب پر رہے ہیں۔ بابا جان خوب تربیت دے رہے ہیں کہ مُردہ جسم میں کس طرح جان ڈالی جاتی ہے، کس طرح راکھ میں سے شعلہ جوالہ پیدا کیا جاتا ہے اور صحرا سے چشمے کیسے پھوٹ سکتے ہیں۔ بابا جان کی شان انشاء اللہ میں تم میں دیکھوں گا اور تم اپنے آپ میں۔ عشق کی قدر کیسی کرنی چاہئے جو ترتیب بابا جان دے رہے ہیں اس کی تفصیل سنو گی تو حیران ہو گی صرف وقت بتائے گا کہ میرے یہاں آنے میں کیا کچھ ہے۔ تمہارے لئے، میرے لئے، ہمارے لئے، سب کے لئے۔ یہ سب نقش ہیں۔

جب راز حقیقت معلوم ہو جائے تو کوئی عجیب بات بھی نہیں اور وہ یہ کہ ہر منزل پر کنارہ بن کر تم ملتی ہو۔ ۱۹۳۷ء میں ایک کنارہ سے چلا۔ اکیس سال ہو گئے، سمندر کا ایک ہی کنارہ ہوتا ہے۔ سمندر پار کرنے کے بعد بھی وہی کنارہ گھوم کر دوسری طرف ملتا ہے یہ تخیل یا شاعری نہیں۔ ٹھوس حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ سنا ہے کنارہ سمندر کو اپنے آغوش میں لیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سمندر محیط ہے یا کنارہ۔

ایک مجذوب نے بابا جان کے دربار میں کہا، شمع اگر ہاتھ میں ہو تو بھی کیا۔ لَو ہاتھ نہیں آسکتی۔ اپنی بتی کو اس تیل میں ڈال دیں اور روشن بتی کی طرف کھسک کھسک کر قُرب حاصل کریں۔ جب مل جائیں تو بتی دو ہوں گی مگر لو ایک۔ یہ بات کس کس جوڑے کے نصیب میں ہوتی ہے۔ قسمت کی بات ہے تم بھی خوش قسمت ہو اور وہ بھی خوش قسمت ہیں۔ بس قسمتوں کے ملنے کی بات ہے۔

انسان جو خدا کو تلاش کرتا ہے تو حقیقت میں اپنے آپ کو ہی تلاش کرتا ہے۔ میرا اپنا آپ تم میں مظہر ہے۔ ذاتِ پاک جو بابا جان میں نہاں اور عیاں ہے ان کے طفیل ہم باطن میں اور ظاہر میں حقیقتاً ایک لو اور دو بتی ہو جائیں اور تمہیں روح کی وہ ساری لطافتیں اور لذتیں اس جیون میں نصیب ہوں۔

قرآن میں ہے کہ عورت تمہاری زمین ہے۔ اس کا مقصد غلط سمجھا جاتا ہے۔ جب طالب حق کا سینہ عشق کو سینچ سینچ کر سمندر ہو جاتا ہے تو اس کو ایک کنارہ عطا ہوتا ہے آخر سمندر کی تہہ میں بھی تو زمین ہی ہے، یعنی زمین سمندر کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے یعنی کنارہ محیط ہے اور زمین کی

آغوش میں سمندر رہے۔ مرد ہمیشہ بے ٹھکانہ ہوتا ہے اس کا ٹھکانا، اس کی وسعت، اس کا تعین، عورت کی ذات ہے۔ یہاں عورت سے مطلب عورت کا عشق ہے یہ سمندر کیا ہوتا ہے۔ یہ پانی کیا چیز ہے۔ جب پیر کامل ذکر خفی کے ذریعہ روح الامین کو سینچنا سکھاتے ہیں تو سینہ سمندر ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں میں تم کو سمجھائوں گا ہی نہیں بلکہ بابا کی شان سے بسائوں گا۔ انشاء اللہ۔

روحانیت کے راستے کے چار مراتب ہیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت۔ معرفت، عرفان کیا ہے یہ چکھنے کی چیز ہے۔ جب مجنوں نے انا لیلیٰ کہا تو لیلیٰ کا عرفان ہو گیا۔ اس سے قبل، علم ہو سکتا ہے، پہچان ہو سکتی ہے۔ مگر عرفان جب ہوتا ہے جب دوئی مٹ جائے تم ٹھیک کہتی ہو، تم ایک لانبی تیز تلوار سے گزر رہی ہو کسی عاشق سے پوچھو پل صراط کس کو کہتے ہیں۔ ہاں ڈرتے ہی رہنا چاہئے۔ زُعم بھی کرے ناز بھی کرے مگر ڈرتا ہی رہے۔ لیلیٰ (روح) بھی شاید چلنے لگی، مبارک ہو۔ واقعی تم بہت خوش نصیب ہو۔ یہ حالت تو بیس بیس سال بھی بھاڑ جھونکنے کے بعد مشکل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نتیس کسی سنت یا کمائی کے لئے ہوتی ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم احسانات کے شکرانہ میں نفل پڑھتے تھے۔ شکر کے سجدے بے گنتی ہوتے ہیں۔ جب دل شاکر ہو تو انسان ہمہ دل شاکر جس کا اظہار خدمت خلق سے ہوتا ہے۔ خدمت بہت بڑا سجدہ ہے۔

شدت کے لئے نصب العین قطعی کلی تعین کے ساتھ ضروری ہے۔ شدت قُرب کی صفت یہ۔ خواہش کی شدت ناکافی ہے۔ ہجر میں مردہ شدت ہے۔ اِسی لئے قلندر کی ایک سانس عابد کی ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے اور عارف کی نیند عابد کی عبادت سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اصل شدت باطن کی اس وقت ہے جب بے نیازی ہو جیسے کُن فیکون سے پہلے۔ (یہ اُدھر سے اللہ کی نظر سے دیکھنے سے بات پیدا ہوتی ہے)۔ عشق کامل میں شدت ہو سکتی ہے۔ مگر کس کے نصیب میں اسی کے لئے ہے کہ مومن ہو اسے بھی زیادہ شدید ہے۔ شدت ذکر، اشدّ ذکراً بعد کی بات ہے سب سے بڑا شرک یہ ہے کہ اللہ کی دین اور رحمت میں اپنی اہلیت یا حق سمجھتے ہیں کہ ملنا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ دودھ میں ملینگنی ڈال دیں۔ ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ سب گناہ معاف ہیں سوائے شرک کے۔

قرب کی نشانی یہ نہیں کہ جو چاہے ہو جائے۔ یہ تو کرم کی وجہ سے ہے، کرامات تو صرف فیض سے ہو سکتی ہے۔ قرب بُو بہ گلاب اندر والی بات ہے۔ قُرب کی نشانی ہے جب آنسو سوکھ جائیں۔ پشاور میں ایسا مانس بابا کو دیکھا۔ یہ جو آنسو بہتے ہیں گنگا جمنا کی طرح، بغیر وجہ یہ لایحزنون والی بات ہے۔ او درمن و من درد ے زیادہ حق معلوم ہوتا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ یہ رحمت سے ہوتی ہے۔ رحمت کی قدر اس وقت ہی ہو سکتی ہے۔ بو یہ گلاب اندر والی دوئی بھی نہ رہے۔

تصور ایمان کی جلا ہے۔ یقین اگر چند لیک میں ہو جائے تو چودھویں صدی میں کامیابی ہے۔ کیونکہ فقراء کا یقین مقدر ہو جاتا ہے۔ سُن کر ہی کسی چیز کا یقین کر لیں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ یقین اتنی مثبت چیز ہے کہ زندگی کی زندگی اس سے بھری ہوئی ہے۔ بسم اللہ کا اذن نہ ہونے سے اٹکے ہیں۔ اسم اعظم کے متعلق دفتر کے دفتر لکھے ہیں مگر عارفین جو زندگی کا نچوڑ دیتے ہیں وہ یہی بسم اللہ ہے قلب و روح اس کی جان اس کے معنی پکڑ لیں تب بات ہے۔ یہی اسم اعظم ہے۔ یہ کُن فیکون سے پہلے کی سی بات ہے۔ ایک فرد سوچ ہی نہیں سکتا، یہ اجتماعیت کی بات ہے۔ اجتماعیت ہی سے زمانہ نے فائدہ اٹھایا ہے۔

''میں ذکر ہو جائوں'' یہ توحید کی طرف سعود ہے۔ ''ذکر میں کھو جائوں'' اسی کا نام فنافی اللہ ہے۔ اللہ ایک ہے، اللہ اسم۔ پیر جسم، یہی طریقہ سب سے افضل ہے بغیر کسی سے سننے کے انسان خود منزلیں طے کرتا چلے۔ یہ سب خلوت کے ساتھ ذکر کی برکات ہیں لوگوں کو ذکر تو مل جاتا ہے مگر اسے اپناتے نہیں۔ مبارک ہو صد مبارک۔

امامت کا راز یہ ہے کہ امامت وہی کرتا ہے جو دل میں بسا ہے اور مالک ہے عبید اللہ نہیں صرف اللہ۔ انسان کی کشتی جوانی کی طرف چل رہی ہو، خواہ ضعیف ہی ہو کیونکہ جنت میں جوان ہی جائیں گے۔ دل جوان ہو یعنی محبت کی خوشبو ہو تو کافی ہے۔ اگر توحید کو پالے تو دل کے ساتھ سارے قویٰ جوان ہو جاتے ہیں۔

محبت ایک روشنی ہے ایک خوشبو ہے اس کے نشر میں کوئی رکاوٹ نہیں البتہ اس کے جذب کرنے میں ہم خود آپ اپنا پردہ ہو جاتے ہیں جیسے اللہ کی رحمت ہر وقت موجود ہے مگر ہمارے حجابات مانع ہوتے ہیں۔ محبت میں فرق نہیں آتا صرف اس کے شعور میں آسکتا ہے یہ قول فیصل ہے اگر مجسم ذکر ہو جائے۔ اس خیال کو بغیر اپنے کو دھوکہ دیئے ذہن نشین کرلو کہ میرا باطن بابا ہے تو تم مجسم ذکر ہو جائو گی۔ یہ خوش نصیبی کسی اور کی ہو نہیں سکتی۔ یہ کچھ بی بی عائشہ والی بات ہے اگر تم اس کو پاسکو۔

اللہ تعالیٰ تم کو قرب عطا کرے۔ قُرب منزل بہ منزل ہوتا ہے معلوم نہیں ہم کس منزل پر ہیں۔ تم خدا کی محبت اور انسان کی محبت کو دو علیحدہ چیزیں سمجھتی ہو۔ جب تک سر نہ کٹائو یہ شکوک کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ امام غزالی کا یہی حال تھا۔ مولانا روم شمس تبریز کے طفیل شکوک کی دلدل سے پار نکل گئے۔

حضورؐ کا فرمان ہے اگر تم شکر کرو تو اللہ اور دے گا۔ اگر شکایت کروگے تو جو ہے سو بھی نہ رہے گا۔ جب یہ رحیم کارساز محبت کا منبع ہے تو شکایت کس سے کریں میں اپنی لانبی بیماری کو سچے دل سے احسان دیکھتا ہوں اور مانتا ہوں۔ جو جو احسانات اس کے ہیں کیا کیا ہم ان کو گن سکتے ہیں۔ یہ نفس ہے جو دودھ میں مینگنی ڈالتا ہے یہ بھی اس کے کرم سے مطیع ہو جاتا ہے۔ بس اللہ اللہ کرو۔ اسی ذکر میں ضم ہو جائو اور سب باتیں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ آزما کر دیکھو۔ یہ خیالی بات نہیں ہے۔

تمہارے متعلق تحت الشعور میں، جو میری آرزو ہے اس کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر آنسو گنگا جمنا کی طرح بہہ رہے تھے۔ ڈائری، دماغ سے متعلق کوئی چیز نہیں۔ دل سے ہے۔ حیات قادر قلب کے مقام سے لکھی گئی ہے۔ روح کی واردات ہیں۔ قرآن بھی قلوب پر اتارا گیا تھا۔ قلب جب متحمل ہوتا ہے تو رمز کو خود پاتا ہے وہ آہنی دیوار قلب اور دماغ کے مابین تم عبور کر گئی ہو۔ مالک کی مدد سے۔ خدا کرے قیام بھی عطا ہو سبحان اللہ پتہ پتہ ذکر کر رہا ہے یہ حالت مجھ پر بابا تاج الدینؒ کے تصرف سے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب پھٹا سچ ہے جلنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ بھسم ہونا، زمان مکان سے ماوراء ہے۔ اللہ اللہ دو بتی ایک لو۔ تم فکر نہ کرنا، روح زمان مکان کی پابند نہیں ہے۔ وہ جو توجہ دیتا ہے ہر اونچ نیچ سے واقف ہوتا ہے۔

بیج بو دیا گیا، ذکر کے پانی سے سیر اب کرو۔ اس کو رحمت کی دھوپ ملتی رہے گی۔ مالی کو اپنے پودے سے بڑی محبت ہے، عشق ہے۔ وہ بے خبر نہیں ہوتا، جب پودا درخت ہو جائے اور پھل دینے لگے تو طاہرہ کی طرح تم کو بھی ابا یا اماں جی یا پیر من، خضر من ہادیٔ من پکارنے لگیں گے۔ گھر کا پتہ پتہ اور اینٹ اینٹ کو خود بہ خود ذاکر ہونا چاہئے بابا جان نے جہاں گشتی کا طوق پہنایا ہے۔ وہ مشن پورا ہو۔

تمہاری پریشانی کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ جب بیج زمین میں دبا دیا جاتا ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو بیج پھول کر پھٹتا ہے اور اس میں سے کلّا نکلتا ہے۔ ذکر کا بیج تمہارے بطن روح میں دبا رہا۔ توجہ اور کچھ نہیں صرف اللہ کے فضل اور رحمت کو ایک آئینہ رخ دے کر کسی پر ڈالتا ہے۔ اس فضل کی گرمی سے کلّا یعنی روح پھوٹ نکلتی ہے جب یہ کلا درخت ہو جائے تب یہ کہتا ہے "انا روحی"، یہ ہے مُوتو قبل انت موتُو۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زندہ سُکرات ہے۔ یہی ہے کلمہ ٔلا الہٰ الا اللہ کی معرفت۔ سارے اِلاہی میں بھسم ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ زبان سے پڑھنا کچھ نہیں بابا جان کہتے ہیں فقیر کلمہ پڑھتا نہیں ہو جاتا ہے۔

"یہ ساری دنیا میرے سینہ میں سما سکتی ہے۔ یہ احساس ثبوت ہے کہ روح کی زندگی مل گئی۔ اللہ مبارک کرے قیام عطا فرمائے۔ بہت سے اچھے لوگ جو بزرگ کہلاتے ہیں ان کو روح کی زندگی کی بھنک بھی نہیں لگی۔ ایسی بات پر تو مطلوب صاحب لوٹ گئے ہیں۔ یہ بابا جان کا کمال ہے کہ آج کل کی مادہ پرست دنیا میں بچوں کی سی سادگی کے ساتھ وہ ساری منازل طے کرا دیتے ہیں۔

عشق ذات سے ہوتا ہے۔ ذات غیب میں ہے، صفات ایک کھڑکی ہے جس کے ذریعہ انسان دیکھ سکتا ہے مگر پہنچ نہیں سکتا اگر عبید اللہ میں اللہ کی صفات ہیں تو اللہ سے عشق ہے۔ اگر حضورؐ کی صفات ہیں تو حضورؐ سے عشق ہے۔ سبحان اللہ۔ کتنے گہرے اور پکے جذبات ہیں۔ عشق صرف اللہ سے ہوتا ہے عبید کوئی چیز نہیں۔ باقی فنافی الرسول، فنافی الشیخ منازل ہیں آئینہ داری کے۔ اب تو آئینہ کی پیار کر لو گی۔ جب قلب پاک ہو جاتا ہے تو پھر یہ آئینہ اور وہ آئینہ کا امتیاز بھی اٹھ جاتا ہے۔ اپنا ہی آئینہ شیخ بھی ہے اور رسولؐ بھی اور اللہ بھی۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔ یہ بڑی کڑوی شراب ہے۔ ابھی وقت ہے اللہ کے فضل سے وہ دن بھی دور نہیں جب رُوح پکار اٹھے گی۔ انا الحق انا الحق۔ کوئی ڈر نہیں۔ پشت پر ہاتھ ہے۔

نبوت وصل کی تفسیر یہ بجز کا رونا کیا۔ وصل کا جو فروغ، جو زندگی، جو جوشِ عمل اور انہماک کار ہے۔ جو سچی خوشی اور روشنی ہے یہ ہی سچا اسلام ہے۔ کیا گناہوں سے توبہ، کیا نااہلیت کا شکوہ۔ اس کی رحمت کے نور سے پُر شاداں شاداں انسان چلا جاتا ہے۔ یہ ہی بابا جان کا بنیادی مشن ہے۔ انسان کو اپنے روح میں قیام دلوا کر اسلام کے اس اصل رمز سے دنیا کو واقف کریں۔ چودھویں صدی کے بعد تاریخ اسلام کو جو ورق لوٹنا ہے یہی ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ ریاضت کی۔ صرف عشق کے بوتے اس کے کرم سے وہ آہنی دیوار پار کر جائے تو بس سب روشن۔ یہ کام باطن سے ہوتے ہیں ظاہر سے ان کا تعلق نہیں۔

فقر کے میدان میں انسان قدم ہی جب رکھتا ہے جب اس کا سر کٹ چکا ہوتا ہے۔ وہ شہید اکبر ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا روح سے ہوتی ہے۔ شہید کبھی نہیں مرتا اور کس بات کی شہادت دیتا ہے۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ جس کے معنی ہیں میں نہیں تو ہی تو ہے۔ سب سے بڑا "الہ" "میں" ہے۔ ہر وقت ہر دم، شعور میں، تحت الشعور میں اس کا ذکر، اس کا فکر۔ یہ عمل ہے کلمۂ طیب کا۔ اس رمز کو کوئی کیا جانے۔ اپنی فنا اس کی بقا۔ راستہ، ذکر، اس کی فکر، کتنا آسان راستہ ہے۔ نہ نفس سے جہاد ہے نہ ماسوا سے غرض۔ سیدھا سادا ذکر، ذکر، ذکر۔ پانی کے قطروں سے بھی پتھر کٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح

اس معلوم ذکر سے سارے جسم کی کثافتیں کٹ جاتی ہیں۔ ذکر کو دو دھاری تلوار کہتے ہیں۔ ایک طرف ظلمتوں کو مٹاتا ہے۔ دوسری طرح نُور سے پُر کرتا ہے۔ دیدار کیا چیز ہے۔ روح کی غذا۔ اس باطنی بھوک کی غذا۔ وصل کیا چیز ہے۔ دو بتی ایک لَو، جس نے ذکر کی اہمیت کو پالیا اس کا بیڑا پار ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے بہت کم نے ذکر کی اہمیت کو پایا ہے۔

کم از کم ایک سفر، سمندری جہاز کا تو ہم جب چلیں گے ضرور کر لیں گے۔ یہ بہت پُر کیف ہوتا ہے۔ مثال غالباً سات آسمان طے کر کے غیب تک پہنچنے کی بھی صحیح ہو گی۔ جب انسان ہوش کے ساتھ چلے تو سفر کی مشکلات کے ساتھ سفر کی کیفیت سے بھی محفوظ ہوتا ہے اور منزل کی قدر بھی کرتا ہے۔ جذب میں چلے تو کسی منزل پر آن کر اٹک جاتا ہے یا کوئی ٹھوکر لگائے تو ہوائی جہاز کی طرح ٹھپ سے آگے کی منزل پر ہوتا ہے۔ کیا طے کیا اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے بابا جان روحانی سفر کو سمندری جہاز کے سفر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زندگی بھی وقت کے دھارے پر ایک سفر ہے۔ بھلا کیا لطف آئے جو افیون کھا کر یا ایک خیالوں کی زندگی میں یہ سفر طے کرے۔ دراصل عمل سے زندگی کا لطف ہے اور عمل کا اسٹیم یا بجلی عشق ہے۔ بے عشق کے، عمل ایک ملمع یا دھوکہ ہے۔

یہ جو نکتہ ہے، ابتدا میں "میں" کا نکتہ ہوتا ہے۔ ہر خیال، ہر عمل کا مرکز، اپنی خودی یا نفس ہوتا ہے۔ جب اس "میں" کی جگہ "تُو" کا نکتہ لگ جائے تو وہ بسم اللہ کا نکتہ ہو جاتا ہے۔

ذکر سے متعلق زیادہ فکر نہ کرنا چاہئے۔ جب دماغ کسی بھی انہماک میں ہو جیسے پڑھنے میں یا کسی سوچ میں تو لازم ہے کہ ذکر کا احساس نہ ہو۔ مگر جب وقفہ ملے تو پھر اللہ اللہ جیسے کوئی ربڑ کی ڈوری ہو اس کا ایک سرا بندھا ہوا اور ایک سرا ہاتھ میں لے کر جتنا چاہو اور ادھر اُدھر گھمائو اور جب چھوڑو تو اپنی اصلی حالت پر۔ صرف احتیاط اتنی کریں کہ ذکر میں سو جائیں اور جب آنکھ ذکر کے ساتھ کُھلے تو وہ ثبوت ہے کہ سوتے میں بھی جاری تھا اور یہ کہ قلب جاری ہے اور جب رات کو خواب کی حالت میں خصوصاً جب کوی ڈر لگے یا کوئی اچھی بات ہو اور خواب میں بھی اس وقت ذکر ہو رہا ہو تو یہ پہچان ہے کہ ذکر روح میں اُتر گیا۔ اور اگر خواب میں بھی ذکر کا ایسا ہی شعور ہو جیسا کہ جاگتے میں تو پھر یہ نشانی ہے کہ ذکر روح میں قائم ہو گیا۔ جب ایسا ہو جائے تو سوائے پیر کے حکم کے اور کوئی طاقت اس کو چھین نہیں سکتی۔

قلب کے ذکر کو، ذکر خفی کہتے ہیں۔ یہ اپنے سے بھی خفی میں ہوتا ہے اور جب اس کا شعور بھی وہ تو خفی و جلی ہوتا ہے۔ جلی ذکر کا کوئی خاص اہمیت نہیں۔ یہ عام ذکر ہے اور رچتا نہیں ہے۔ خفی ذکر پہلے تو مذکور کے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور جب روح میں قائم ہو جائے تو دوئی مٹ جاتی ہے اور انا لیلیٰ کہنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان "پتہ نہیں" کے مقام کو اس وقت عبور کرتا ہے جب غیب پر فتح پالے۔ یہ عطا ہے، اپنی کوشش کچھ نہیں۔ نہ اس میں وقت کا سوال ہے نہ قسمت کا، یار کی موج کی بات ہے۔ جب ٹھوکر لگائی پار ہو گئے۔ میں کوئی کنجوسی نہیں کر رہا ہوں۔ یار کو منانے کے ڈھنگ کچھ نہیں آتے۔ وہ نیاز جو تھی یار کو منانے کی بات تھی۔

جن محسوسات سے تم گزر رہی ہو ان سے صرف کوئی کوئی خوش قسمت گزرتا ہے میری ارتقاء تقریباً ایسی ہی ہوئی تھی۔ مگر عموماً لوگ بیل کے بیل رہتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ پردہ ہٹتے یعنی مرنے کے بعد پھر سارا معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

جب دل کی کلی کھلتی ہے تو ہر شخص ناچتا ہے۔ یہ کیفیت زندگی میں صرف تین بار ہوتی ہے۔ نو عمری میں جب پہلے پہلے عشق گدگداتا ہے۔ دوسرے جب پیر کی نظر کرم ہوتی ہے۔ تیسرے شہادت پر یا مومن کی موت کے وقت۔

دیکھنا کسے کہتے ہیں یہ ایک بہت اونچے مقام کی بات ہے بڑا طویل معاملہ ہے لقا کسے کہتے ہیں۔ مازاغ البصر کیا ہے۔ اُف میں کیسے بتائوں۔ موسیٰؑ تیسرے آسمان کے باسی ہیں۔ گو کلیم اللہ ہیں مگر دماغ سے کام لیتے تھے۔ عیسیٰؑ چوتھے آسمان کے ہیں یعنی قلب کے مقام کے شہنشاہ۔ رسول کریمؐ ساتویں آسمان کو پار کر گئے اور ہم غلم ہیں ان کے۔ مالک کے ساتھ ہم بھی وہیں ہوں گے۔

تم عُبید ہو چک ہو اور حضور عزیز سے عزیز۔ سبحان اللہ۔ یہ کفر نہیں بلکہ اسلامی توحید ہے۔ "پتہ نہیں کیا چاہتی ہو۔" یہ بالکل سچ ہے جو کہتے ہیں یہ چاہتا ہوں وہ چاہتا ہوں یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں۔ حقیقت تو چکھنے کی بات ہے اور جب چکھ چکے تو پھر اور کیا ہے۔ نہ بابا جان نے پوچھا نہ خیال میں آیا کہ میں چاہتا کیا ہوں۔ ایک لگن تھی اور ہے اور بس۔ اس کا نہ آگا نہ پیچھا۔ قبلہ نے یوں حق رفاقت ادا کیا۔ راہر و منزل حق کو ساتھ ہی لیا۔ بائی صاحبہ نے بھی حق زوجیت اچھی طرح ادا کیا۔ اصلہا ثابتٌ بن کر مضبوطی سے شجر طیبہ کو تھامے رکھا و گرنہ فرعہانی السماء کی شدتِ قلندرانہ میں کس کے پائوں زمین پر ٹھہتے ہیں۔ عروج کے بعد مقام عبدیت کِس کس کو نصیب ہوتا ہے۔ جب تک بائی صاحبہ کی صحت نے ساتھ دیا روزانہ قبلہ کے ناسور کی مرہم پٹی اپنے ہی ذمہ رکھی۔ غذا، آرام کی سختی سے دیکھ بھال رکھی انہیں قبلہ کے جسم کے شکستہ ہوے کا حال معلوم تھا اس لئے دوست احباب کی ان کوششوں کو حتی المقدور روکے رکھا جس کے تحت ود قبلہ لو مختلف محفلوں میں شرکت کرانے کے لئے لگے رہتے تھے۔ ان پابندیوں سے قبلہ کی بیقرار طبیعت اور جہاں گشتی کی عادت میں رکاوٹ تو ضرور پڑی مگر قبلہ کی صحت کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ پھر اب کئی سالوں سے بای صاحبہ کے صاحبِ فراش ہو جانے سے سب ہی کے دل دکھے۔ گھر کی وہ چہل پہل وہ رونق۔ وہ بائی صاحبہ کی ہر ایک میں دلبستگی کے مواقع ختم ہوئے پھر بھی اپنی بساط سے زیادہ اپنے بیماری کے بستر سے بھی ہر ایک کو دعائیں ہی دیں اور شفقت کی نظر رکھی۔ قبلہ نے بھی اس طویل صبر آزما دور میں یہ تکلیف بائی کے ساتھ ساتھ خود بھی کاٹی۔ منزلِ فقر میں یہ جسم کا پنجرہ جیتے جی ہی اتارنا پڑتا ہے۔ صدیوں کے نسلی خون کی پاکی اور طہارت کی جاتی ہے۔ یہ چالیس دن والے چلوں تک کی بات نہیں ہوتی جتنے اعلیٰ مقامات میں پرواز اتنی ہی کثافتوں سے صفائی کرانا ضروری ہوتی ہے جو منزل قمر النساء نے ایک حد تک اپنی کم عمری میں پار کر لی اور ان کی بیماری نے اس کا ذریعہ پیدا کیا۔ اسی قسم یا اس سے بلند منزل کی جانب اب اختر النساء بیگم کا سفر بھی ہو رہا ہے۔ جن فضائوں میں اب قبلہ کی پرواز ہے وہاں اور شدتیں ہیں اور اس زمانہ سے کہیں زیادہ بڑا جب قمر النساء بیگم کا ساتھ تھا۔ جن انوار سے اس وقت بائی صاحب کا گزر ہے اس کی جھلکیاں کبھی کبھی ان کی ہی زبان سے بے ساختگی میں نکل جاتی ہیں۔ یہ عالم برزخ کی کیفیات ہیں جن کی فہم اس شعور اور ادراک سے پرے ہے۔ اسی لئے بظاہر یہ ایک مبالغہ سا معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ یوں بھی جب عقل و ہوش و ادراک اور جسم و جان کے بندھن ڈھیلے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں تو نور باطن چمک اٹھتا ہے اور حقیقت سے روشناسی ہو رہی ہوتی ہے۔ موتو قبل اَنت موتو کی منزل پار ہو کر، روح کو قیامِ ابدی نصیب ہوتا ہے۔ یہ مقامِ حیرت ہے۔ نسبت محمدی اور قربہ حق کے نشاط دوام میں حیات ابدی ہے۔

بائی صاحبہ کی اس برسوں کی بیماری سے قبلہ کی صحت پر بھی اثر پڑا ہے۔ اول تو اب اس دردِ دل سے کوئی قبلہ کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا اور پھر ادب کا پہلو خدمت پر عمل پیرا ہونے میں حائل رہتا ہے کس کی ہمت اور کس کی مجال جو قبلہ کو ان کے درد کا درماں بننے کے لئے اپنی پیشکس کرے یا دوادارو، علاج معالجہ، دیکھ بھال کرانے پر مجبور کرے۔ قبلہ نے بھی بائی کی تکلیف کے غم کو بہت کچھ اپنے پر لیا ہے۔ پشاور سے باہر آنا جانا برسوں سے بند

ہے۔ زیادہ تر وقت بائی کے ساتھ کمرے میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دلجوئی میں کمی نہ ہو اور بائی صاحبہ تنہائی محسوس نہ کریں۔ مگر قبلہ کو دیکھا جائے تو جیسے شاہباز فضائے اعلیٰ کے بال و پر ترش گئے ہوں۔ بزرگوں کے ساتھ وہ محفلیں وہ مزارات کی حاضری، مقامات کی سیر تقریباً بالکل بند ہے صبر و وفا کی تصویر بن کر اپنی اس جسمانی حالت اور بائی صاحبہ کی اس طویل بیماری میں بھی وہ حق ادا کیا ہے کہ اچھے اچھے فقراء اس منزل میں رہ گئے۔ حق زوجیت سے کہیں ہزاروں گنا زائد بائی صاحبہ کی دل بستگی کی ہے۔ حالانکہ فقر میں کیسی پابندی، فقیر کے آگے غیر اللہ کی گنجائش کہاں۔ سب کچھ بھسم ہو کر رہ جاتا ہے۔ الفقر ہو اللہ، فقر کی اس شان جلالی کو بھی قبلہ نے اپنی ہی ذات میں جذب کر لیا ہے۔ اس کی تفسیر نہ قلم سے بیان ہو سکتی ہے نہ الفاظ اس کی تشریح کی تاب لا سکتے ہیں۔ تخیل ہی میں کوئی اس حالت سے گزر کر دیکھے۔ چند سال نہ سہی چند گھنٹے ہی سہی۔ ایک طرف نفس کلی کی نازِ نمرود ہے دوسری طرح رحمت کُل کے گلزار ابراہیمی ایک طرف عورت جہنم کا ایندھن کہلائی تو دوسری طرف عورت، خوشبو، نماز، قراہ العین آنکھوں کی ٹھنڈک معراج المومنین۔ قاب قوسین، عکس رُخسار، گویا

عشق مجنوں نیست ایں کارِ من است

حُسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است